باعث بن رہے ہیں۔مختلف زبانوں میں کتاب کے ترجمے کا خیال غالباً پہلے سے کائزر کے ذہن میں تھا۔بہرحال اس کی طرف پیش رفت ہوئی اور ایک فاضل مترجم نے (جن کا نام میرے علم میں نہیں) اسے اردو میں منتقل کر دیا۔

اردو ترجمے پر نظر ثانی اور اس کی تسہیل کے لیے مسودہ دوبارہ مجھے بھجوایا گیا اور بحمد اللہ اس کے اردو متن کو آخری شکل دینے اور پھر پاکستان میں اس کی اشاعت کا انتظام کرنے میں مجھے بھی حصہ ڈالنے کا موقع ملا۔اردو بازار، لاہور کے اشاعتی ادارے، دارالکتاب کے مالک اور ہمارے دوست حافظ محمد ندیم صاحب نے ازراہ عنایت اس کی اشاعت کے لیے آمادگی ظاہر کی اور چند ماہ قبل یہ کتاب ''امیر عبد القادر الجزائری: سچے جہاد کی ایک داستان'' کے عنوان سے دارالکتاب کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

انیسویں صدی میں عالم اسلام کی وہ شخصیات جنھوں نے مسلم ممالک پر یورپ کے مختلف ممالک کی استعماری یلغار کے خلاف مزاحمانہ جدوجہد کی، ان میں الجزائر کے امیر عبد القادر الجزائریؒ کا نام اس حوالے سے ممتاز ہے کہ ان کی جرات واستقلال، عزیمت واستقامت، حوصلہ وتدبر اور فکر وکردار کی عظمت کو ان کے دشمنوں نے بھی سراہا اور ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔امیر عبد القادر نے انیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد کی اور ایک ایسا نمونہ پیش کیا جسے بلاشبہ اسلام کے تصور جہاد اور جنگی اخلاقیات کا ایک درست اور بڑی حد تک معیاری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔امیر عبد القادر کے تصور جہاد کے اہم اور نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں:

۱۔ان کے نزدیک مسلمانوں کے ملک پر کسی غیر مسلم طاقت کے تسلط کی صورت میں اس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ایک شرعی اور دینی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی جذبے سے روحانی غور وفکر اور تعلیم وتدریس کی زندگی کو ترک کر کے فرانس کے خلاف مسلح جدوجہد آزادی کو منظم کیا۔

۲۔ان کے ہاں جہاد کا مقصد طاقت یا اقتدار کا حصول نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے جدوجہد آزادی کی قیادت خود سنبھالنے سے قبل بھی شاہ مراکش سے درخواست کی کہ وہ اس جدوجہد کی سرپرستی اور راہ نمائی کریں اور پھر جب ایسا نہ ہو سکنے کی وجہ سے انھیں خود اس جدوجہد کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالنا پڑی تو الجزائر کے ایک وسیع علاقے میں اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے بعد انھوں نے دوبارہ شاہ مراکش کو خط لکھا کہ وہ اس الجزائر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیں اور یہاں کے معاملات کو چلانے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ مقرر کر دیں۔

۳۔امیر کے ہاں اس امر کا احساس بھی بہت واضح ہے کہ کسی غیر ملکی طاقت کے خلاف جدوجہد آزادی چند لازمی شرائط کے پورا ہونے پر منحصر ہے اور ان کو پورا کیے بغیر کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔مثال کے طور پر انھوں نے نہایت دانش مندی سے یہ سمجھا کہ مسلح جدوجہد کا فیصلہ کسی فرد یا کسی گروہ کو اپنے طور پر نہیں بلکہ پوری قوم کے اتفاق رائے سے کرنا چاہیے تاکہ جدوجہد مضبوط اخلاقی اور نفسیاتی بنیادوں پر قائم ہو اور اسے قوم کی اجتماعی تائید حاصل ہو، کیونکہ اگر قوم ہی اس جدوجہد کے نتائج کا سامنا کرنے اور اس کے لیے درکار جانی اور مالی قربانی دینے کے حوصلے سے محروم ہو تو کوئی گروہ اپنے بل بوتے پر اسے کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتا۔اسی وجہ سے امیر نے فرانس کے خلاف لڑائی شروع

کرنے سے پہلے الجزائر کے بڑے بڑے قبائل کے سرداروں سے مشاورت کر کے ان کی تائید اور حمایت کو یقینی بنایا۔ اسی طرح امیر نے یہ بات بھی وضاحت سے کہی کہ ایک منظم فوج کے خلاف جنگ کسی دوسری منظم طاقت کی سرپرستی کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی، چنانچہ انھوں نے ابتدا شاہ مراکش سے اس جدوجہد کی سیاسی سرپرستی کی درخواست کی اور پھر اس میں ناکامی کے بعد الجزائر کی نمائندہ قبائلی طاقتوں کی تائید سے اپنی امارت قائم کرنے کے بعد ہی عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔

۴۔ امیر عبد القادر نے اس بدیہی حقیقت کا بھی ادراک کیا کہ جنگ میں فریقین کے مابین طاقت کے ایک خاص توازن اور عسکری تربیت میں دشمن کی برابری حاصل کیے بغیر زیادہ دیر تک میدان جنگ میں نہیں ٹھہرا جا سکتا، چنانچہ انھوں نے اپنی فوج کو مغربی طرز پر منظم کیا اور جدید طرز کی اسلحہ سازی کے لیے مغربی ملکوں سے مطلوبہ سامان اور ماہرین فراہم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی۔ امیر کی حکمت عملی کا یہ پہلو بھی بے حد قابل توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کا ہدف کسی نظری آئیڈیل کی روشنی میں نہیں بلکہ زمینی حقائق کی روشنی میں متعین کیا اور الجزائر کی سرزمین سے فرانس کو کلیتاً بے دخل کر دینے کو اپنا ہدف قرار دینے کے بجائے اس بات کو قبول کیا کہ فرانس کی عمل داری ساحلی شہروں تک محدود رہے جبکہ الجزائر کے باقی علاقے میں مسلمانوں کی ایک آزاد امارت قائم ہو۔

۵۔ امیر کے ہاں عملی حقائق کے ادراک کا ایک ممتاز پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے عالمی حالات اور دنیا کے تہذیبی ارتقا پر نظر رکھتے ہوئے درست طور پر یہ سمجھا کہ مغربی اقوام نے تمدن اور سائنس کے میدان میں جو ترقی کی ہے، وہ درحقیقت انسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور مسلمان بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، چنانچہ انھوں نے نہ صرف فرانسیسی حکمرانوں کے نام خطوط میں جا بجا اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ فرانس اور الجزائر کے مابین دشمنی کے بجائے دوستی کا تعلق قائم ہونا چاہیے تاکہ دونوں قومیں مفادات کے اشتراک کی بنیاد پر ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکیں، بلکہ عملاً بھی اپنی امارت کے تحت الجزائری قوم کی تنظیم نو میں امیر نے مغرب کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

۶۔ امیر کی جدوجہد سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے جان و مال کو جنگ میں بے فائدہ ضائع کروانے اور ایک لاحاصل جدوجہد کو جاری رکھنے کو شرعی تقاضا نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک کسی غیر مسلم قابض کے خلاف جہاد کی ذمہ داری اسی وقت تک عائد ہوتی ہے جب تک اس کی کامیابی کے لیے درکار عملی اسباب و وسائل میسر اور امکانات موجود ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جدوجہد کے آخری مرحلے پر جب یہ دیکھا کہ الجزائری قوم ان کا ساتھ چھوڑ کر فرانسیسی کیمپ کا حصہ بن چکی ہے اور خود ان کے ساتھ وابستہ ایک چھوٹا سا گروہ بھی مسلسل خطرے میں ہے تو انھوں نے کسی جھجھک کے بغیر نہایت جرات سے یہ فیصلہ کر لیا کہ الجزائر کی سرزمین پر فرانس کی حکمرانی خدا کی منشا ہے اور اس کو تسلیم کر لینا ہی دانش مندی ہے۔

۷۔ امیر عبد القادر کے تصور جہاد کا ایک نہایت اہم پہلو اسلام کی جنگی اخلاقیات کی پابندی کرنا ہے اور اس ضمن میں ان کا پیش کردہ نمونہ ہی دراصل مغربی دنیا میں ان کے تعارف اور تعظیم و احترام کی اصل وجہ ہے۔ امیر نے نہ صرف

جدوجہد آزادی کے دوران میں فرانسیسی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مذہبی ضروریات کا فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی سے بندوبست کیا بلکہ دمشق میں رہائش کے زمانے میں ۱۸۶۰ میں ہونے والے مسلم مسیحی فسادات میں بھی ہزاروں مسیحی باشندوں کی حفاظت کے لیے عملی کردار ادا کر کے اسلامی اخلاقیات کی ایک معیاری اور قابل تقلید مثال پیش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ تمام حوالوں سے امیر عبد القادر کی جدوجہد عصر حاضر میں مغرب کے سیاسی واقتصادی تسلط کے خلاف عسکری جدوجہد کرنے والوں گروہوں کے لیے اپنے اندر راہ نمائی کا بڑا سامان رکھتی ہے اور امیر عبد القادر کے فلسفہ جنگ اور طرز جدوجہد کے ان پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

(محمد عمار خان ناصر)

امیر عبد القادر الجزائری (۱۸۰۷ء-۱۸۸۳ء) تحریک آزادئ الجزائر کے عظیم مجاہد اور سرفروش قائد وراہنما تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں الجزائر پر فرانس کے غاصبانہ قبضے کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور الجزائری قوم میں اسلامیت کی لہر دوڑا دی۔ الجزائر کے مختلف قبائل کو متحد کیا اور ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ وہ تیرہ سال تک اس اسلامی مملکت کے امیر رہے۔ اس دوران انھوں نے کئی بار فرانسیسی افواج کو ناکوں چنے چبوائے، مگر اپنوں کی غداری کی وجہ سے انھیں بالآخر فرانس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کچھ شرائط کے ساتھ معاہدہ ہوا اور امیر نے خود کو فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا جنھوں نے اپنے وعدوں کی پاس داری نہ کرتے ہوئے انھیں برس ہا برس تک قید میں رکھا۔ پھر فرانس لے جائے گئے اور وہاں نظر بند رہے اور آخر رہا کر کے جلا وطن کر دیے گئے۔ عمر کا آخری حصہ دمشق میں گزرا تا آنکہ وقت آخر آ گیا۔

امریکی مصنف جان ڈبلیو کائزر کی یہ کتاب (اردو ترجمہ) اسی مرد مجاہد کے سچے جہاد کی داستان ہے جس کے مطالعہ سے انسانی فکر ونظر کے تغیر وتبدیل اور ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے، مسلمان کس قدر سادہ اور اعتماد کرنے والا ہوتا ہے جبکہ اہل یورپ کس قدر عیار اور بدعہد ہوتے ہیں۔ وہ معاہدوں کی پاس داری نہیں کرتے، بلکہ معاہدے کرتے ہی اس لیے ہیں کہ انھیں توڑا جائے اور کمزور کی بے بسی اور بے سروسامانی کے مزے لیے جائیں۔

یہ کتاب انسانی زندگی کے نشیب وفراز کی کہانی ہے کہ جوانی میں انسانی رگوں میں خون نہیں، سیال فولاد دوڑتا ہے۔ وہ پہاڑوں سے ٹکراتا اور سمندروں کو پھلانگتا ہے، مگر جب عمر ڈھلتی ہے تو پھر اس کی سوچ بدل جاتی ہے اور پھر کچھ ایسا کرنا چاہتا ہے جس سے دوسروں کو سکھ اور چین میسر آئے۔ امیر عبد القادر نے جب فرانس کی بھرپور حربی طاقت کے مقابلے میں اپنی فوجی قوت کا جائزہ لیا تو مکمل تباہی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ایسے وقت میں انھوں نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا اور اپنے ہم وطنوں اور ساتھیوں کو مروانے کے بجائے زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنی قیمت پر اپنی قوم کو زندگی دی۔ ایک دانش مند قائد کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنی فکر کی بجائے قوم کے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اہل یورپ سے شکست کھائی، اپنے ہی گھر کے چراغوں کی

غداری سے کھائی اور یہ بھی یورپی ممالک کس طرح دوسرے ممالک کے قائدین، تحریکوں اور نظریات کے بارے میں اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ کتاب یورپی اور مغربی نفسیات کا پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ تاریخ میں ''امیر عبد القادر'' کی صورت میں رہ کر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے اور مسلمان صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، انسانوں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔

ایک وہ وقت تھا جب امیر یورپ کی نظروں میں وقت کے سب سے بڑے دہشت گرد تھے اور جب انھوں نے دمشق میں قیام کے دوران مسلم عیسائی فسادات میں پندرہ ہزار عیسائیوں کی جانیں بچائیں تو انھیں امن کا عظیم علمبردار اور دیوتا قرار دے دیا گیا۔

یہ کتاب معروضی حالات سے آنکھیں بند کر کے محض جوش سے کام لینے والے روایتی دوستوں کو شاید پسند نہ آئے، مگر سعید روحوں کے لیے اس میں بڑے سبق ہیں۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب حالات موافق نہ ہوں تو خود کو اور اپنی قوم کو بچا لینا سب سے بڑی بہادری ہوتی ہے۔ امیر صرف جنگجو رہنما ہی نہ تھے، ایک جید عالم دین اور صوفی بزرگ بھی تھے۔ ان کے یہ الفاظ ہم سب کے لیے بالعموم اور وراثت پیغمبر کے حاملین کے لیے خاص پیغام رکھتے ہیں:

''پیغمبر ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے، کم از کم بنیادی اصولوں کی حد تک تو نہیں کرتے۔ ان سب کا ایک ہی پیغام ہے کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو اور مخلوق کے ساتھ رحم دلی سے پیش آؤ۔'' (ص: ۳۸۵)

اہل علم کو سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی ان کے شب و روز اپنے ہی لوگوں کی تردید و تغلیط میں نہیں جا رہے؟ اس کتاب کا مقدمہ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے لکھا ہے اور امیر کا تعارف کروایا ہے جو بجائے خود ایک معرکتہ الآرا مقالہ ہے۔ دار الکتاب لاہور کے حافظ محمد ندیم صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ''القاسم'' محسوس کرتا ہے کہ اگر کتاب کا مطالعہ اس کی روح کے مطابق کیا جائے تو ذہنوں میں انقلاب آئے گا جو آج کے دور میں امت مسلمہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ بہ حیثیت مسلمان ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہر ایک سے جنگ و جدل، مخالفت اور مخاصمت نے ہمیں کیا دیا ہے؟ کیا ہم ''مسلمان'' بن کر نہیں رہ سکتے؟

(بشکریہ ماہنامہ ''القاسم''، نوشہرہ)

''اسلام کا تصور جہاد اور القاعدہ''

ہمارا ایک بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم شہرت، دولت اور امارت جیسی چیزوں کو عزت کے اسباب قرار دے کر تخلیقی اور علمی صلاحیتوں کے حامل ان لوگوں کی قدر اور عزت افزائی سے گریز کرتے ہیں جو کہ معاشرہ کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر کے بعض مواقع پر اپنی سلامتی اور مستقبل کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ کہتے ہیں، مسلمان اپنے مزاج کے مطابق مردہ پرست واقع ہوتے آئے ہیں۔ اس کی تشریح کچھ یوں کی جا سکتی ہے کہ ہم زندہ لوگوں کی یا تو قدر افزائی نہیں کرتے یا ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے۔ اسی رویے کا نتیجہ ہے کہ ہم مثبت کردار کے لوگوں کی ناقدری کے

باعث مثبت معاشرتی رویوں کی بھی حوصلہ شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پشتون بیلٹ میں جاری خوں ریزی نے ہمارے معاشرے کو عملاً تباہ کر کے اس کے مستقبل کو سوالیہ نشان بنا دیا ہے، تاہم ہمارے دانش وروں، صحافیوں اور دوسرے باشعور حلقوں نے جاری خوں ریزی کے اسباب، اس کے کرداروں کے تعین اور مسئلہ کے نظریاتی توڑ جیسی بنیادی چیزوں کو اجاگر کرنے کا اپنا فریضہ اس طریقے سے پورا نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عوام کو ظالم، مظلوم اور قاتل، مقتول کا فرق سمجھانے کے اپنے فرض اور ذمہ داری میں بھی ناکام رہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے عوام کو درست معلومات پہنچانے کے علاوہ شعور دینے کا اپنا فریضہ بھی درست طریقے سے انجام دیا ہے۔ ضلع شانگلہ سے تعلق رکھنے والے صاحب مطالعہ اور باجرات انسان سیف الحق چکیسری ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے جاری جنگ کے اسباب، کرداروں، مقاصد اور واقعات کو انتہائی جرات اور موثر طریقے سے اپنی تحریروں کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا مشکل اور خطرناک فریضہ بہت احسن طریقے سے نبھایا۔

موصوف کی کتاب ''اسلام کا تصور جہاد اور القاعدہ'' سال ۲۰۱۰ء کو مینگورہ سوات کے شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز نے بہت خوب صورت ترتیب اور پیکنگ کے ساتھ چھاپا ہے۔ ۴۵/ابواب اور ۶۵۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم جیسے ان لوگوں کو بھی قدم قدم پر اپنی کم علمی کا احساس ہونے لگتا ہے جو کہ جاری جنگ کے معاملہ پر خود کو بہت باخبر اور ماہر سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر سیف الحق چکیسری کا تعلق کسی بڑے شہر سے ہوتا یا ان کی مذکورہ کتاب کسی بڑے کمرشل ادارے نے چھاپی ہوتی تو اپنے مواد کے سبب اس کاوش کا شمار آج پاکستان کے بیسٹ سیلر بکس میں ہوتا اور موصوف کو ان ایشوز پر ایک مستند ماہر کا مقام حاصل ہو جاتا۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ وہ تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے ایک ملک کے تیسرے درجے کے ایک صوبے کے ایک تیسرے درجے کے علاقے سے تعلق رکھنے والے محقق ہیں۔ اس کتاب کو اگر جہاد، دہشت گردی، بدامنی، ریاستی ناکامیوں اور سیاسی کوتاہیوں کی تفصیلات کے تناظر میں موثر ترین اور مستند ترین دستاویز کا نام دیا جائے تو یہ اس کاوش کی مناسب ترین تعریف ہوگی۔ شعیب سنز نے سوات میں رہ کر بھی اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر کے بڑی جرات کا کام کیا ہے جبکہ اس ادارے نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ایک نسبتاً بہت چھوٹے شہر میں رہ کر بھی اتنی اچھی اور خوب صورت کتابی چھاپی جا سکتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کاوش دیکھ اور پڑھ کر جہاں اس طالب علم کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا، وہاں اس امر کی بہت خوشی ہوئی کہ جس علاقہ سے میں تعلق رکھتا ہوں، وہاں کے لوگ انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس طرح کا کام کر سکتے ہیں، ورنہ ہم تو لکیر کے فقیر بننے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور اکثر مواقع پر حقائق پر پردہ ڈالنا اپنا قومی مزاج سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ ایک کارکن صحافی اور اس خطے کے ایک باشندے کی حیثیت سے اس طالب العلم نے جاری جنگ کو نہ صرف یہ کہ بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے باعث اس پیچیدہ جنگ پر سیکڑوں خبریں فائل کرنے کے علاوہ لاتعداد تبصرے بھی کیے ہیں جبکہ اس موضوع پر تین کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ تاہم سیف الحق چکیسری

کی اس کاوش اور تخلیق کے سامنے ہمارا کام بہت ہی کم، سطحی اور محدود رہا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران مجھے قدم قدم پر یہ سوچ کر شرمندگی محسوس ہوتی رہی کہ میں نے اپنی عادت اور ضرورت کے مطابق معاوضہ ادا کر کے اتنی اہم دستاویز سے استفادہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے باوجود کہ میں ان موضوعات پر پاکستانی دانش وروں اور صحافیوں کے علاوہ عالمی تجزیہ کاروں کی قریباً تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں، میرا ذاتی مشاہدہ اور تاثر فقط یہی ہے کہ ان موضوعات پر یہ اب تک کی مستند ترین دستاویز ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد عام قارئین تو ایک طرف، ہم جیسے لوگوں کو بھی دوسری کوئی کتاب، تخلیق یا دستاویز پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

۱۴۵/ابواب اور ۶۵۰ صفحات پر مشتمل اس کاوش کی قیمت محض ۳۸۰ روپے رکھی گئی ہے جو کہ کسی بھی شخص کے لیے کوئی زیادہ رقم قطعاً نہیں ہے۔ سیف الحق چکیسری نے بے مثال تخلیق، ناقابل تردید معلومات، درکار حوالہ جات اور دل دہلا دینے والے واقعات کو جس خوب صورت طریقے سے قلم بند کر کے انھیں عوام، خواص کے لیے ذاتی رسک لے کر پیش کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ ان کے صاحب مطالعہ اور صاحب مشاہدہ ہونے کا عملی نمونہ ہے، بلکہ یہ اس بات کا بھی ایک بڑا ثبوت ہے کہ شانگلہ میں محض سیاست اور دولت کے باعث شہرت پانے والے نہیں، بلکہ اس علاقہ میں ۴۷ سالہ وہ تخلیق کار اور باجرات قلمی مجاہد بھی رہتا ہے جس کی اس کاوش کو اگر ہم آج نظر انداز کر دیں تو بھی مستقبل کی تاریخ اور محققین کے لیے اس کاوش کو بہ طور حوالہ پیش کیے بغیر آگے بڑھنا بہت مشکل ہوگا۔

اس کتاب کا سب سے خوب صورت حصہ وہ ہے جس میں مصنف نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ دوسروں کے علاوہ ان کے اپنے کوالی فائیڈ صاحب زادے بھی اس کوشش پر کمنٹس دینے سے گریزاں تھے اور یہ بھی کہ ان میں سے شاید ایک یا دو تو مصنف کے دلائل سے اتفاق بھی نہیں رکھتا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کاوش کو لمحہ ضائع کیے بغیر پڑھا اور سمجھا جائے۔ سیاست، ریاست اور صحافت کے شہ سواروں کے لیے تو یہ کتاب پڑھنا انتہائی ضروری ہے۔ چلتے چلتے امن کی علم بردار صوبائی حکومت اور علاقہ میں سیاست کرنے والے صاحب حیثیت لوگوں کو مفت میں ایک مشورہ یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ اربوں اور کروڑوں کی قومی اور ذاتی دولت میں سے چند لاکھ خرچ کر کے اس کتاب کو اپنے اداروں اور کارکنوں کے لیے خرید کر اپنی امن پسندی اور حب الوطنی کی مثال پیش کرنے کی کوشش ضرور کریں۔

(تبصرہ: عقیل یوسف زئی۔ روزنامہ آزادی، سوات)

خطبہ حجۃ الوداع

اسلامی تعلیمات کا عالمی منشور

تدوین وتخریج متن: محمد عمار خان ناصر

توضیحی محاضرات: مولانا زاہد الراشدی

[صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۱۰۰ روپے]

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

اسلام اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں

محاضرات: مولانا زاہد الراشدی

ضبط وتحریر: ناصر الدین خان عامر

[صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۶۵ روپے]

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے ساتھ

ایک علمی وفکری مکالمہ

(ریاست کے بغیر جہاد، علما کا سیاسی کردار، زکوۃ کے علاوہ ٹیکس کا جواز اور دیگر موضوعات)

از: ابو عمار زاہد الراشدی / معز امجد / خورشید احمد ندیم / ڈاکٹر محمد فاروق خانؒ

[صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۱۰۰]

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ